کیا دیکھتا ہے کہ خونخوار شیر چشمہ کے کنارے ایک بے بس ہرن پر ٹوٹ پڑا ہے اور اپنے آہنی جبڑے اس کی گردن میں چبھو رہا ہے۔

اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھ کر اس کا ہیاؤ چھوٹ گیا۔ وہ بے اختیاری طور پر اٹھا اور سوچنے لگا کہ مندر میں جا چھپوں مگر اسی اثناء میں ایک لاغر اندام شخص جس کی ریش دراز ناف تک آئی ہوئی تھی اور چہرہ بدر کامل کی طرح منور تھا۔ ہاتھ میں ایک گنڈا سا لیے نکلا اور دلیرانہ قدم بڑھاتا ہوا شیر کے سر پر جا پہنچا۔ شیر جھلایا تو تھا ہی، شعلہ بار آنکھوں سے گھورتا ہوا دوڑا مگر نزدیک آتے ہی اس کی آنکھیں جھپک گئیں اور ایک خطاوار شخص کی طرح جو اپنے آقا سے معافی کا طالب ہو زمین پر لیٹ گیا۔

سادھو نے آتے ہی نیم جان کو آغوش میں اٹھا لیا اور مندر میں لا کر مرگ چھالے پر لٹا دیا۔ چند بوٹیاں پتھر پر گھس کر اس کے زخموں پر لگائیں اور تب اپنی کفنی کو جس پر تازہ گلابی خون زیب دے رہے تھے، دھونے کے لیے چشمے کی طرف چلا۔ کوئی شیو کا پجاری کمل کے پھولوں کو جل دان کے لیے جاتا ہو۔

پرتاپ چند اس حیرت انگیز کرشمے سے اتنا متاثر ہوا کہ کچھ دیر تک نقش دیوار کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر سوچنے لگا، افسوس! کیا میری آتما اتنی کمزور ہے؟ کیا مجھے اپنی جان اتنی پیاری ہے۔

پرتاپ چند اپنی بزدلی پر ایسا جھنجھلایا کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ خون جوش کھانے لگا۔ ایک مضبوط لکڑی کا کندہ اٹھا کر کسی بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ٹانگوں سے دوڑتا ہوا شیر کے کلے پر جا پہنچا۔

شیر نے دیکھا اور دیکھتے ہی اس کے تیور بدل گئے۔ بادل کی طرح گرجا اور قریب تھا کہ جست مار کر پرتاپ کی گردن دبوچ لے کہ اتنے میں لکڑی کا کندہ اپنی پوری طاقت سے اس کے سر پر پٹک دیا۔ مگر شیر کے فولادی سر پر اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

وہ اور بھی جھلایا اور زور سے گرجا کہ جنگل کے تمام جانور اپنی کمین گاہوں سے نکل پڑے اور دونوں اگلے پنجوں کو شیر نے پرتاپ کی کمر میں ڈال دیا۔ دفعتاً اس کے سر پر گنڈاسے کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ طیش کھا کر پیچھے کی طرف دیکھا تو سادھو بابا کھڑے ہیں۔ اس نے فوراً پرتاپ کو چھوڑ دیا اور درد سے کراہتا ہوا بھاگا۔

پرتاپ چند نے ان باباجی کو اکثر مندر سے آتے جاتے دیکھا تھا مگر اس وقت جو اور نزدیک سے ان کے پرجلال چہرے پر نگاہ ڈالی تو صورت کچھ مانوس سی معلوم ہوئی۔ سوچنے لگا کہ میں نے انہیں کہاں دیکھا ہے؟ مگر حافظے نے یاری نہ دی۔ ندامت سے سر جھکا کر بولا

''میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟''

سادھو جی نے مسکرا کر فرمایا

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ برسوں آپ کی گود میں کھیلا ہوں''

اتنا سنتے ہی پرتاپ کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ کلیجہ نے جست ماری لبوں تک آپہنچا۔

ایک فرزندانہ پرجوش اور بے خودی کے ساتھ ان کے سینے سے لپٹ گیا اور آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔

منشی سنجیون لال نے پدرانہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آنسو پونچھنے لگے۔

21

تیاری

جیسے کوئی منجدھار میں پڑی کشتی طوفان کے تھپیڑوں اور تلاطم کے جھکولوں سے اپنی جان بچا کر کسی بندگاہ کی آغوش میں جا پہنچتی ہے۔ اسی طرح پرتاپ چند اب ایک ایسے مسکن میں آگیا تھا جہاں اس کے دماغ کو اطمینان تھا اور دل کو قرار۔

وہ اب اس بھولے بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح نہ تھا جو اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہو۔ اب اسے اپنا راستہ اور منزل مقصود صاف نظر آتے تھے۔ منشی سنجیون لال کی صحبت اور تلقین نے چند ہی مہینوں میں اس کے دل سے وہ کمزوریاں محو کر دیں جنہیں وہ سخت کوششوں کے بعد بھی دور کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہ ہوا تھا۔ ایک عارف کامل کی چند روزہ تزکیہ نفس کے لیے برسوں کی اندرونی کشمکش اور مطالعہ سے بدرجہا بہتر زیادہ مفید ہوتی ہے۔

منشی جی اسے ہر روز بھگوت گیتا پڑھاتے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بحر عمیق کی غواصی میں صرف کیا تھا اور ادھر تین چار سال تک ہی یوگیوں اور سنیاسیوں کے خرمن دانش سے خوشہ چینی کی تھی۔ وہ ایک ایک نکتہ چینی کی ایسی تشریح کرتے۔ ان کا لہجہ ایسا دلکش اور طرز بیان ایسا سرور انگیز تھا کہ پرتاپ پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ ان کے ایک ایک لفظ میں وہ اثر ہوتا تھا جو کسی خانقاہ روحانیت کے بسنے والے ہی کی باتوں میں ہو سکتا ہے۔

پرتاپ چند کے خیالات روز بروز زیادہ پاک، زیادہ بے غرض اور حوصلے زیادہ وسیع اور زیادہ بلند ہوتے جاتے تھے۔

اس نے یوگ کی مشق بھی شروع کر دی تھی، جوں جوں اس میدان میں وہ آگے قدم بڑھاتا تھا، اس کی ہمدردیاں زیادہ وسیع اور عام ہوتی جاتی تھیں۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ پرتاپ چند کے قوائے جسمانی شیروں کی طرح مضبوط اور تنومند ہو گئے۔ اونچی سے اونچی پہاڑیوں پر بے تکان چڑھ جاتا۔ منزلوں کی مسافت طے کر کے یوں آ بیٹھتا گویا کسی باغ کی سیر کر کے لوٹا ہے۔

قوت برداشت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ برفستانی پر سنگین چوٹیوں پر کا بستر بنا کر ایسے آرام سے لیٹتا گویا آراستہ مکان میں مخملی گدوں پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ ایسا روشن ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک جاتیں۔ اس پر شانوں تک بکھرے

ہوئے بال، درد سے بھری ہوئی آواز اور آنکھیں اسے رحم کی مورت بنائے ہوئے تھیں۔ روشن رخساروں پر سبزہ نو دمیدہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا پروانے شمع پر نثار ہو رہے ہیں۔ کیسا حسن مردانہ تھا کہ پہلی ہی نظر میں اس کی تصویر پردہ دل پر ہمیشہ کے لیے کھینچ جاتی تھی۔

یقیناً جب وہ اپنا آسن بچھا کر یوگ سادھن کرتا ہوگا تو کیلاش کی بسنے والی اپسرائیں اس پر نثار ہوتی ہوں گی۔ جس وقت وہ جڑی بوٹیوں کو بقچہ لے کر قدم بڑھاتا ہوا چلتا تو پہاڑوں کے بسنے والے مرد اور عورتیں اضطراری طور پر اس کے روبرو سر جھکاتے اور جس وقت جھاڑیاں اور چٹانیں اسے اپنے دامنوں میں چھپا لیتیں اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتے۔ اس کے علاج میں تاثیر تھی۔ باتوں میں وہ مٹھاس اور آنکھوں میں وہ جادو کہ گرد و نواح کے لوگ یہ سمجھتے کہ وہ دیولوک کا رشی ہے

ایک روز سنجیون لال نے پرتاپ چند سے کہا۔

''بالانند جی! چلو اب تمہیں دوسرے مقامات کی سیر کراؤں۔ اس پاک سرزمین پر کتنے ہی سنیاسی اور رشی دنیا سے مونہہ موڑ کر بھگوت بھجن کر رہے ہیں۔ میں نے ایک بار سب کے درشن کر لیے ہیں مگر اب پھر ان کے درشن کرنے کے لیے جی بے چین ہو رہا ہے''

پرتاپ: ''میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ یہاں سے کس طرف کا مقصد ہے؟''

سنجیون لال ''پہلے سنت دھام کو چلیں گے، وہاں کئی مہاتماؤں کے درشن ہوں گے۔ وہاں سے پورب کی طرف کیلاش ہے، کیلاش سے سیدھے گیان سرور کی طرف سدھاریں گے۔ ایسا دلکش مقام پردہ زمین اور کہیں نہ ہوگا۔ عین ساگر کے کنارے شری برہمانند جی کا دھام ہے۔ ان کے قدموں پر سر جھکائیں گے۔ مجھے کتنے ہی رشیوں سے فیض محبت کا موقع ملا ہے مگر برہمانند جی تاروں میں چاند ہیں

تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے''

پرتاپ چند نے روانگی کی تیاری کرنی شروع کی اور تیاری کیا تھی۔ دو مرگ چھالے، جڑی بوٹیوں کا بقچہ اور چند کتابیں اس مسکن کی ساری کائنات تھی۔ انہیں اس نے بغل میں دبایا اور دونوں چل کھڑے ہوئے۔

مگر ابھی یہ پہاڑی سے اترے بھی نہ تھے کہ جنگلی جانوروں کے غول کے غول چیختے چلاتے اچھلتے کودتے نظر آتے۔ ہرن، بکریاں، ریچھ، شیر، چیتے سب کے سب پہلو بہ پہلو بھاگے چلے آتے تھے۔ گویا ہر ایک اپنی دھن میں ایسا مست تھا کہ اسے دوسروں کی خبر نہ تھی کہ آن کی آن میں ان جانوروں نے ان دونوں بھگوڑوں کے گرد حلقہ باندھ لیا۔

کوئی ان کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ کوئی پیروں کے اوپر سر رگڑنے لگا۔ کوئی دردناک آواز میں چیخ رہا تھا کوئی اکڑوں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاک رہا تھا۔ گویا اپنے محسن کی جدائی کا صدمہ اظہار کی قابلیت سے بہت زیادہ دلدوز تھا۔ بے زبانوں کے دل میں بھی وہی جذبہ محبت اور وہی صدمہ فراق ہوتا ہے جو حضرت انسان کی زندگی تلخ کر دیتا ہے۔ اگرچہ اس کا اظہار صرف انہیں لوگوں کے روبرو ہوتا ہے جن کی اندرونی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور جن کی آتمائیں اس قدر وسیع کہ جسم ظاہر کی نیر نگیاں ان کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔

ایک یہ کہ اس کوہستان کے ذی روح سے ان دونوں آدمیوں کو سچی ہمدردی تھی۔ ان کا مسکن ان بے زبانوں کی خوش فعلیوں کا نظارہ کا اکھاڑا تھا اور ان کے ننھے ننھے خوبصورت بچوں کے سونے کا گہوارہ اور کلیلیں کرنے کا میدان، اس پر سحر حلقہ میں آ کر ان کی باہمی رنجشیں اور کدورتیں مٹ جایا کرتی تھیں۔

شام ہو گئی تھی اور دونوں آدمی مردانہ وار قدم بڑھاتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، اس کوہستان کے ایک ایک کونے اور گوشہ گوشہ کا نقشہ ان کا نگاہ میں کھنچا ہوا تھا نہ

ان کے قدم پھسلتے تھے نہ ان کے قدم ڈگمگاتے تھے۔ تیرہ وتار وادیاں جہاں شاید کسی ذی روح نے قدم نہ رکھا تھا۔

عمودی چوٹیاں جس کی بلندی کو پرندے بھی نگاہ حسرت سے دیکھیں۔ ان کے لیے ایسے سہل گزار راستے تھے جیسے کوئی صاف ستھری سڑک یا کسی باغ کی روش، ان کے دل مردوں کے دل تھے اور اعضاء شیروں کے

پرتاپ کا تو خیر عنفوان شباب تھا مگر منشی جی بھی باوجود پیرانہ سالی کے ایک چٹان سے دوسری چٹان پر کود جاتے اور پرشور کوہستانی نالوں میں بے محابا گھس پڑتے، گویا ان موانعات ظاہری کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔

اسی طرح جادہ پیمائی میں کئی مہینے گزر گئے۔ دن بھر راستہ چلتے اور رات کو کسی مہاتما رشی کے استھان پر ٹھہر جاتے اور اس کے ست سنگ سے فیض یاب ہوتے۔ پرتاپ چند کو اکثر یہ خیال گزرتا کہ اگر یہ فطرت قدسی کی صفایت کے ساتھ خدمات کی طرف متوجہ ہوتے تو فکر وفریب، جور وجبر کا نشان مٹا دیتے۔ کیسے روشن دل لوگ تھے۔ کیسے مستغنی، دولت وشہرت، ثروت وجاہ، نام ونمود اور دوسری دنیاوی نعمتیں جو حضرت انسان کی زندگی کا معراج خیال کی جاتی ہیں، ان کی نگاہوں میں محض سنگریزے تھے جو حقیقت کے موتے اور گیان وسرور کے نواح میں آ پہنچے۔

آہ کیسا سہانا منظر تھا۔ اسے دلکش کہنا، اس کی مذمت کرتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی جگہ ایسی ہی ہے جسے اس کی آنکھ کہہ سکیں تو وہ کوہ ہمالیہ ہے اور یہ جگہ اس کی آنکھ کی پتلی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے پرانوں میں دیولوک کا مقدس نام دیا گیا ہے۔ یہاں گندھرب اور اپسرائیں بستی ہیں اور ان کے بہشتی نغموں کی دلآویز صدا شوق کے کانوں میں آتی ہے۔ پرتاپ پر اس منظر نے خودمستی کی کیفیت طاری کر دی۔ نگاہیں ادھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں۔

روح اور قلب پر ایک تقدس آمیز رعب چھا رہا تھا۔ کوئی کیسا ہی بے اعتقاد شخص

کیوں نہ ہو مگر اس پاک سرزمین میں داخل ہوتے ہی اس کی روح پر وہ سرور رہو گا جو اسے مدت العمر یاد رہے گا۔

یہاں کی ہوا میں سانس اور یہاں کی زمین پر قدم رکھنا جام روحانیت سے شادکام ہونا ہے۔ دونوں طرف نگاہ جہاں تک جاتی ہے سر بفلک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایک کے اوپر ایک دلپذیر بے قاعدگی کے ساتھ لدی ہوئی ہے۔ گویا آسمان پر منڈلانے والے بادل یہاں تک سیر کرنے کے لیے اتر آئے ہیں۔ ان کی چوٹیوں پر جابجا برف کے تودے پڑے ہوئے ہیں۔ جنہیں آفتاب کی آخری شعاعوں نے زرنگار بنا دیا ہے۔ جیسے اتنی بلندی پر روحان شمسی کے لیے سنہری تخت سجائے گئے ہوں۔

انہیں پہاڑیوں کے بیچ میں گیان سرور آہستہ آہستہ موجیں مار رہا تھا۔ گیان کی طرح اتھاہ اور اپار اس میں ہنس، بط اور بگلے خوش فعلیاں کر رہے تھے گویا آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہوں۔

یکا یک منشی سنجیون لال نے کہا

"بالا جی، دیکھو، جھیل کے کنارے وہ چھوٹی سی کٹی جو نظر آ رہی ہے وہی برہمانند جی کا استھان ہے"

یہ سنتے ہی اشتیاق نے پرتاپ چند کے قدم اور بھی تیز کر دیئے۔ ذرا دیر میں دونوں کٹی کے دروزے پر پہنچ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سوامی براہمانند جی جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے سندھیا کرنے میں مصروف ہیں۔

ان کا چہرہ ایسا پر جلال تھا گویا آفتاب ابھی ابھی گیان سرور کے آغوش سے نکل آیا ہے۔

جب سے منشی سنجیون لال تیرتھ یاترا کو نکلے اور پرتاپ چند الہ آباد چلا گیا اس وقت سے سباما کی زندگی کی روش بالکل تبدیل ہوگئی تھی۔ اس نے ٹھیکہ کے کاروبار کو ترقی دینا شروع کیا اور اسے نہایت وسیع پیانے پر پہنچا دیا۔

مستری جی بدستور دیانتداری اور ہوشیاری سے اپنا کام کرتے تھے۔ منشی سنجیون لال کے زمانے میں بھی کاروبار کو اتنا فروغ حاصل نہ ہوا تھا۔ سباما رات کی رات بیٹھے اینٹ پتھر سے سر مارا کرتی تھی اور سرخی چونے کی فکر میں پریشان رہتی۔ پائی پائی کا حساب جانچتی۔ اور کبھی کبھی مزدوروں کے کام کی دیکھ بھال کرتی۔

ان کاموں میں اسے ایسا انہماک ہوا کہ دان اور برت سے جو اس کے پرانے شغل تھے کسی قدر لاپرواہی ظاہر ہونے لگی۔ باوجود روز افزوں آمدنی کے سباما نے خرچ کی کوئی مد زیادہ نہ ہونے دی۔ کوڑی کوڑی دانتوں سے پکڑتی اور یہ سب اس لیے کہ پرتاپ چند صاحب مال ہو جائے اور اپنی زندگی فارغ البال وخوش حال رہے۔

سباما کو اپنے ہونہار بیٹے پر ناز تھا۔ اس کی زندگی کی رفتار دیکھ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو آرزو دل میں رکھ کر میں نے اولاد مانگی تھی وہ آرزو پوری ہوگی، وہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں سے پرتاپ کا خفیہ طور پر پتہ دریافت کرتی تھی اور ان کی رپورٹوں کا مطالعہ اس کے لیے ایک دلچسپ افسانہ تھا۔ ایسی صورت میں الہ آباد سے پرتاپ چند کے لاپتہ ہو جانے کا تار پہنچنا گویا دل و دماغ پر بجلی کا گرنا تھا۔

سباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر تھام کر بیٹھ گئی

تیسرے دن پرتاپ چند کی کتابیں، کپڑے اور دوسرے اسباب بھی آ پہنچے۔ یہ زخم پر ایک اور چرکہ تھا۔ ایک دن وہ پرتاپ چند کی کتابیں الٹ پلٹ رہی تھی کہ اسے ایک ریشمی رومال میں بہت سے خطوط حفاظت سے لپٹے ہوئے دکھائی دیئے۔

یہ برجن کے خطوط تھے، سباما انہیں پڑھنے لگی اور ایک ایک کر کے سارا دفتر ختم کر

ڈالا۔ آج وہ بہت روئی، دوسرے دن برجن نے جب خبر سنی تو وہ گھبرائی ہوئی سباما کے یہاں آئی۔ سباما نے خطوط کا ایک پلندہ اس کے سامنے پھینک دیا اور منہ پھیر لیا۔ برجن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پر غرور لہجہ میں بولی

''چچی! اس بدگمانی پر آپ بہت پچھتائیں گی!''

یہ کہہ کر وہ الٹے قدم اپنے گھر لوٹ آئی

پریم وتی کے مرنے کی خبر پاتے ہی پران ناتھ پٹنہ سے اور رادھا چرن نینی تال سے روانہ ہوئے۔ اس کے جیتے جی آتے تو ملاقات ہوتی۔ مرنے پر آئے تو مٹی دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔

مرتک شریر سنسکار سب بڑی دھوم دھام سے ادا کیے گئے۔ دو ہفتہ گاؤں میں خوب چہل رہی۔ اس کے بعد رادھا چرن مرادآباد چلے گئے۔

اور پران ناتھ نے پٹنہ چلنے کی تیاری شروع کی، ان کا ارادہ تھا کہ بیوی کو الہ آباد پہنچاتے ہوئے پٹنہ جائیں مگر سیوتی نے ضد کی کہ جہاں یہاں تک آئے ہیں تو برجن کے پاس بھی ضرور چلنا چاہیے، ورنہ اسے صدمہ ہوگا۔ سمجھے گی کہ مجھے بیکس سمجھ کر ان لوگوں نے بھی تیاگ دیا۔ للو نے بہت حیل و حجت کی کہ مجھ سے جواب طلب ہو جائے گا۔ معطل ہو جاؤں گا۔ کیا عجب ہے کہ تنزلی کی نوبت آ جائے۔ آخر سیوتی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ان کی طرف اس انوکھی ادا اور نگاہ سے دیکھا جس میں مایوسی بھی تھی، ضد بھی اور رضا بھی تھی، اور محبت بھی

للو اس نگاہ سحر کی تاب نہ لا سکے۔ رضا نے وہ کام کر دکھایا جو ضد سے مشکل تھا۔ بیوی کے گل عارض کا بوسہ لے کر بولے

''رو دیں کیوں؟''

سیوتی: ''اچھا تمہارا ہی کہنا کریں گے، لو اب خوش ہو جاؤ!''

للو مدہوش ہو گیا۔ اس نگاہ میں خموں کا نشہ ہے، اسی نگاہ نے گھر کر دیئے ہیں، گلوں

پر خنجر چلا دیئے ہیں۔ سلطنتیں مٹا دی ہیں۔ للو نے تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا صرف ایک معزز عہدہ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک ننھی سی آنکھ میں کتنی طاقت ہے۔

سیوتی کا اس ویران خانہ میں آنا گویا پھولوں میں مہک کا آنا ہے۔ ہفتہ بھر کے لیے اچھے دنوں کی بو باس آ گئی۔ برجن بہت خوش ہوئی اور خوب روئی،

مادھوی نے منو کو گود میں لے کر خوب سا پیار کیا مردانے کمرے مہینوں سے بند تھے آج ان کی قسمتیں بھی کھلیں اجڑا ہوا آشیانہ بسا

پریم وتی کے چلے جانے کے بعد برجن اس گھر میں اکیلی رہ گئی تھی صرف مادھوی اس کی انیس و غمخوار تھی۔ اس تنہائی، سوز جگر اور درد دل نے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرنے لگی۔

شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ وہ درد کے ہوں یا مسرت کے، اسی وقت دل میں پیدا ہوتے ہیں جب ہم درد یا مسرت کا مزہ چکھتے ہیں اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد ان کا زبان قلم پر آنا تو ایک آسان بات ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ سوز اور بیراگ کا ایک ایک دفتر ہوتا ہے۔

دوسرے شاعروں کے دل میں دوستوں کی واہ واہ، اور سخن سنجوں کی سبحان اللہ سے ولولے پیدا ہوتے ہیں مگر برجن اپنی داستان غم اپنے ہی دل کو سناتی تھی۔ اس کے بلند خیالوں کی داد دینے والی شمع خاموش تھی اور سمند فکر کو تازیانہ لگانے والی بے کسی تھی۔

سیوتی کو آئے دو تین دن گزرے تھے ایک دن اس نے برجن سے کہا

"میں تمہیں اکثر کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا پاتی ہوں اور کچھ لکھتے بھی دیکھتی ہوں مجھ کو نہ بتاؤ گی"

برجن شرما گئی بہانہ کرنے لگی کہ کچھ نہیں یونہی جی کچھ کھویا سا رہتا ہے، سیوتی نے کہا۔ میں نہ مانوں گی۔ یہ کہہ کر وہ برجن کا صندوقچہ اٹھا لائی۔ جس میں شاعری کے

آبدار موتی رکھے ہوئے تھے۔ مجبور ہو کر برجن نے اسے اپنی تازہ نظم سنائی۔ منہ سے پہلے مصرعہ کا نکلنا تھا کہ سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جب تک ساری نظم ختم نہ ہوئی وہ نقش حیرت بنی بیٹھی رہی پران ناتھ کی صحبت نے اس میں سخن فہمی کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر تازہ مصرعہ سے اس کے گوشہ جگر میں ایک کسک سی ہوتی تھی اور آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔ جب برجن خاموش ہوئی تو ایک سماں بندھا ہوا تھا جیسے کوئی دلکش نغمہ بند ہو گیا ہو۔ سیوتی نے برجن کو گلے لگایا اور دوڑی ہوئی للو کے پاس گئی جیسے کوئی بچہ نیا کھلونا پا کر خوشی سے دوڑتا ہوا اپنے ہمجولیوں کو دکھانے جائے

للو اپنے آقائے نامدار کو عرضی لکھ رہے تھے کہ میری والدہ سخت بیمار ہو گئیں اس وجہ سے حاضر خدمت ہونے میں دیر ہوئی۔ امیدوار ہوں کہ ایک ہفتہ کی رخصت عطا فرمائی جائے۔ سیوتی کو دیکھ کر جھٹ اپنی درخواست چھپا دی اور مسکرائے، انسان کیس ابھی رہے، اپنے آپ کو دھوکہ دینے سے نہیں چوکتا۔

سیوتی: ''ذرا اندر چلو تمہیں برجن کی کویتا سنواؤں، پھڑک اٹھو گے!''

پران ''اچھا؟ اب انہیں کویتا کا شوق ہوا ہے، ان کی بھاوج بھی تو گایا کرتی تھیں''

سیوتی: ''تم تو شیام بڑے بے خبر ہو، ذرا چل کر سنو تو، پیچھے ہنسنا، مجھے تو اس کی شاعری پر اچنبھا ہو رہا ہے''

پران: ''چلو ایک خط لکھ لوں پھر آتا ہوں''

سیوتی: ''اب یہی مجھے اچھا نہیں لگتا میں آ کے کاغذ نوچ ڈالوں گی''

سیوتی پران ناتھ کو کشاں کشاں لے آئی۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ برجن نے کوئی معمولی بھجن بنایا ہوگا۔ اسی کو سنانے کے لیے بے قرار ہو رہی ہوگی

مگر جب اندر آ کر بیٹھے اور برجن نے شرماتے ہوئے اپنی پر زور نظم پریم کی متوالی پڑھنی شروع کی تو حضرت کی آنکھیں کھل گئیں

نظم کیا تھی، درد دل کا دریا اور راز الفت کا ایک دفتر تھی۔ للو سنتے تھے اور وجد میں آ

آ کر جھومتے تھے۔ الفاظ کی ایک ایک نشست پر خیال کی ایک ایک پرواز پر بے اختیار دل سے داد نکلتی تھی۔

انہوں نے بہت سے شاعروں کے کلام دیکھے تھے مگر یہ بلند پروازی، یہ تازگی، یہ جذبہ کہیں نظر نہ آیا تھا۔ اس وقت کا سماں بندھ گیا جب طلوع آفتاب سے قبل بادِ نسیم لہراتی ہوئی چلتی ہے۔ کلیاں کھلتی ہیں، پھول مہکتے ہیں اور آسمان پر ہلکی سرخی چھا جاتی ہے۔ ایک ایک شعر دمیں گلہائے تازہ کی شوخی اور شبنم کی تازگی موجود تھی۔

اس پر برجن کا سریلا پن اور آواز کی گرمی نشہ پر بادِ صبا کا کام کر رہی تھی۔ آہ! یہ وہ اشعار تھے جن پر برجن نے دل کو شمع کی طرح جلایا تھا

للو تمسخر کی نیت سے آئے تھے مگر جب وہ اٹھے تو واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا، گویا پہلو سے دل نکل گیا۔ ایک دن انہوں نے برجن سے کہا

''تمہارا کلام چھپے تو بہت مقبول ہو''

برجن نے سر جھکا کر کہا

''مجھے یقین نہیں کہ کوئی اس کی قدر کرے''

پران ناتھ ''ایسا ممکن ہی نہیں اگر دلوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو تمہارے کلام کی ضرور قدر ہو گی، ایسے لوگ موجود ہیں جو پھولوں کی مہک سے سرشار ہو جاتے ہیں جو چڑیوں کی چہک اور چاندنی رات کے سہانے پن کا لطف اٹھا سکتے ہیں تو وہ تمہاری کویتا کو ضرور دل میں جگہ دیں گے''

برجن کے دل میں وہ گدگدی پیدا ہوئی جو ہر ایک مصنف کو اپنے فکر و سخن کی داد ملنے اور اپنے کلام کے مقبول و مطبوع ہونے کے خیال سے ہوتی ہے

تاہم وہ نہیں نہیں کرتی رہی مگر وہ نہیں ہاں کے برابر تھی۔ الہ آباد سے ان دنوں کملا نام کا اچھا رسالہ نکلتا تھا۔ پران ناتھ نے پریم کی متوالی کو وہاں بھیج دیا۔

ایڈیٹر صاحب ایک نکتہ سنج بزرگ تھے۔ دل کھول کر کلام کی داد دی اور قدر کی۔ اور

جب یہ متوالی نازنین کملا کے خوشوں میں رنگین لباس پہن کر نکلی تو لوں نے اسے دل میں بٹھایا اور آنکھوں میں جگہ دی

شاید ہی کسی شاعر کی فکر اولین کو ایسی قبولیت عام نصیب ہوئی ہو۔ لوگ پڑھتے تھے اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے۔ سخن فہم حلقوں میں ہفتوں تک متوالی نازنین کے چرچے رہے کسی کو یقین ہی نہ آتا کہ یہ ایک گمنام شاعرہ کا کلام ہے۔ فیصلہ یہی تھا کہ اس شاعرہ کو الہام ہو گیا ہے

اب ماہ بہ ماہ کملا کے صفحے برجن کے کلام سے مزین ہونے لگے، اور بھارت مہلا کا نام بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گیا۔ کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جو بھارت مہلا کے کلام سے اپنے تئیں نہ سنوارتا ہو۔ اخبار کھولتے ہی ناظرین کی آنکھیں بھارت مہلا کو ڈھونڈنے لگتیں۔ ہاں اس کی آتش بیانیاں اب کسی کو حیرت میں نہ ڈالتیں۔ اس نے خود شاعری کا معیار اونچا کر دیا تھا۔

قلم و سخن کی رانی کے لیے کمال شاعری خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو ایک لازمی امر تھا نہ کہ قابل حیرت تین سال تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ بھارت مہلا کون ہے آ کر پران ناتھ سے رہا نہ گیا۔ برجن سے انہیں سخن فہمانہ عقیدت ہو گئی تھی اور وہ مہینوں سے اس کے حالات زندگی لکھنے کی فکر میں پریشان تھے۔ سیوتی کے ذریعے سے رفتہ رفتہ اس کے سوانح حیات سب دریافت کر لیے بھارت مہلا کے عنوان سے ایک پر زور مضمون لکھا۔

پران ناتھ نے پہلے کبھی کوئی مضمون نہ لکھا تھا مگر فرط عقیدت نے ان کے قلم کو تیز اور فصیح بنا دیا تھا۔ عبارت اول سے آخر تک چست اور خیالات پاکیزہ تھے۔

اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ برجن کو ہر چہار طرف سے قدر دانی کے نذرانے ملنے لگے۔ رادھا چرن مراد آباد سے اس کی ملاقات کو آئے، کملا امادیئی سیتا چندر کنور اور کتنی ہی پرانی سکھیاں جنہوں نے یاد بھلا دی تھی، ہر روز برجن کے درشنوں کو آنے

لگیں۔ بڑے بڑے صاحب نظر روسا جو خودداری کی شان میں حکام کے روبرو بھی سر نہ جھکاتے تھے، برجن کے دروازے کی زیارت کو آتے تھے چندرا خود تو نہ آسکی مگر خط میں لکھا، جی چاہتا ہے کہ تمہارے پیروں پر سر رکھ کر گھنٹوں روؤں، برجن کے دروازے پر ہر دم ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔

23

امتحان

منشی سنجیون لال اور پرتاپ چند جوں ہی سوامی برہمانند جی کے روبرو پہنچے کہ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں نور حقیقت سے ایسی لبریز تھیں جیسے گیان سرور آب مصفا سے دونوں نووارد وں نے ان کے قدم آنکھوں سے لگائے سوامی جی نے انہیں اٹھا کر چھاتی سے لگایا اور منشی جی دیر تک سفر کی باتیں پوچھتے رہے۔ بعد ازاں مسکرا کر پرتاپ کی طرف دیکھا اور فرط شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے

"تھک تو نہیں گئے"

پرتاپ چند کچھ جواب نہ دے سکا۔ اسے اس وقت وہ سرور قلب حاصل ہو رہا تھا۔ جس کا مزہ دل لیتا ہے۔ مگر زبان نہیں کہہ سکتی جس وقت وہ سوامی جی کے سینہ سے لپٹا اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پریم کے دریائے بے پایاں میں غوطہ لگا رہا ہوں۔ اس کا دل و دماغ خود بخود کسی پر زور کشش سے کھنچا ہوا چلا جاتا تھا، جیسے کوئی کشتی لہروں کی زد میں لنگر تڑا کر بہہ جاتی ہے۔ وہی کیفیت اس کی ہو رہی تھی۔ کلیجہ تھا کہ اڈا چلا جاتا تھا، جیسے کوئی اسے حیرتل ہوتی تھی کہ میری یہ حالت کیوں ہوتی جاتی ہے۔ حسن و عشق کی کشش کا اسے تجربہ ہو چکا تھا مگر اس وقت محبت کا جو پر سرور غلبہ اس کی روح پر ہو رہا تھا، وہ خیال، فکر اور تمیز کے اندازے سے باہر تھا۔

مگر یہ کیفیت صرف پرتاپ ہی کی نہ تھی، منشی جی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ

سوامی جی برہمانند جی کی پرنور آنکھیں بھی آب جو ہوگئی ہیں اور ان کے روشن چہرہ پر جو سرور اور عافیت کی تصویر تھا، پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ کیوں؟ کیا کشتی نے دریا میں ہلچل ڈال دی اور دریا بھی وہ جس کی تھاہ نہیں۔ ایسا تو کہیں ہوتے نہیں دیکھا۔

دوسرے دن سوامی جی نے بالک رام کو ویدوں کی تلقین شروع کی۔ ایسے عارف کامل کے روبرو زانوئے ارادت تہہ کرنا وہ موقع تھا جس پر فرشتے بھی ناز کریں تو بجا ہے۔ جس وقت وہ زبان مبارک سے اپنے دلربا لہجہ میں وید کے رچاؤں کی تشریح کرنے لگتے تو ہوا کی چڑیاں اور کوہ بیابان کے جانوریوں آ کر جمع ہوتے گویا کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ درختوں کا جھومنا بن ہو جاتا، مانسرور کی لہریں تھم جاتیں، ساری فطرت پر ایک مدہوشی کا عالم چھا جاتا، کلام فطرت کے یہ ادنیٰ کرشمے ہیں سوامی جی کے خیالات کیلاش کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند اور گیان سرووری کی سطح بلوریں سے بھی زیادہ روشن تھے۔ حقائق معرفت پر جب تقریر کرتے تو معنی کا دریا بہا دیتے۔ ادب اور فلسفہ کے بادشاہ مبارک تھے۔ وہ راتیں جب سوامی جی ایک مرگ چھالے پر مانسرور کے لب آب لیتے اور ویاس اور والمیک کے پاکیزہ خیالات کی داد دیتے۔

حیرت تو یہ تھی کہ اس گنج عافیت میں وہ بھی سوامی جی علم اور تہذیب کی رفتار تازہ ترین سے آگاہ تھے اور اکثر جدید علمی انکشافات اور نظری تحقیقات پر ایسے پر وزن خیالات کا اظہار کرتے کہ پرتاپ دنگ رہ جاتا۔

اس کٹی کے آستانے پر دنیا کے کتنے ہی علماء و فضلا نے جبہ سائی کی تھی اور کتنے سیاح، مدبر، فلسفی اور شاعر ہر سال اس مقام کی زیارت کو آیا کرتے تھے۔ یورپ کے مصالح ملکی کی کتنی ہی گتھیاں اسی گیان سرووری کے کنارے سلجھائی گئی تھیں اور تاریخ و فلسفہ کے کتنے ہی عقدے یہاں حل ہو رہے تھے۔

پرتاپ چند کو یہاں یورپ کے بعض نامور علماء سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سی ایسی تصنیفیں دیکھنے میں آئیں جو الہ آباد کے کتب خانوں میں بھی نظر نہ آئی تھیں یہ ان زائرین کی یادگاریں تھیں جو وقتاً فوقتاً یہاں آئے تھے اور جب کبھی دنیا کے کسی حصے میں کسی صیغہ علم پر کوئی معرکے کی کتاب لکھی جاتی تو خود مصنف یا سوامی کا کوئی معتقد اسے ضرور یہاں بھیج دیا کرتا۔ وہ ایک بادشاہ تھا کہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دور دراز کے ممالک سے علم وتحقیقات کا خراج لیا کرتا۔

مادی سلطنت ایک محدود شے ہے مگر روحانی شے بھی وسیع اور وسعت سے بھی زیادہ فراخ ہے، تخت زرگار کی، فقیری بوریئے کی ہستی کے سامنے کچھ نہیں۔ پرتاپ چند نے اپنی عقل وذہن کا دامن اس علم وہنر کے کان سے خوب آزادی کے ساتھ بھرا اور یورپ کی کئی زبانوں کا ماہر ہو گیا۔

پانچ سال گزر گئے۔

گرمی کے دن تھے، کوہ اور دریا نے گرمی سے تنگ آ کر اپنے سفید لباس اتارنے شروع کر دیئے تھے۔ آسمان کا نیلا پن آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ چاروں طرف ہریالی پھیلی ہوئی تھی ایک روز پرتاپ چند گیان سرووَر کے کنارے یوگ سادھن میں مصروف تھا کہ سوامی جی نے سنجیون لال سے کہا

''میرے خیال میں بالا جی کو اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ انہیں رخصت کر دوں مگر ان سے کچھ ایسی محبت ہو گئی ہے کہ جدائی کا خیال شاق گزرتا ہے آپ کو میری اس کمزوری پر تعجب ہو گا مگر میں آج آپ سے کہتا ہوں کہ پرتاپ چند میرا بیٹا ہے''

سنجیون لال (حیرت سے) ''ایں!''

سوامی جی ''اسی خیال سے آپ میری کمزوری معافی کے قابل سمجھیں۔ پہلے ہی جب میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تو پرانی محبت تازہ ہو گئی اور میں ضبط و

استقلال سے کام نہ لیتا تو یقین تھا کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور راز افشا ہو جاتا۔ آج پورے بیس سال گزرے جب میں نے اس دنیا سے منہ موڑا تھا۔ اس وقت کی تصویر آج بھی میری نگاہوں میں ہے۔ جب میں شام کے وقت رخصت ہوا تھا پرتاپ چھ سال کا بھی نہ ہوا تھا، وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا تھا اور ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا''

مگر پرماتما کے سوا اور کون جان سکتا تھا کہ اسے اپنے خیال سے دور رکھنے کے لیے کتنے ضبط اور ترک سے کام لیا۔ برسوں تک ہر دم اس کی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی۔ بارے ایشور کی دیا سے میں نفس پر غالب ہوا۔ اور اٹھارہ برسوں تک پرتاپ ایک لمحے کے لیے میرے دھیان میں نہیں آیا۔ مگر جوں ہی آپ کے ساتھ دیکھا تو پرانی یاد تازہ ہو گئی۔

مجھے اپنے بیراگ پر گھمنڈ تھا کہ اب مایا کا میرے دل میں گزر نہیں ہو سکتا۔ مگر بالا جی نے میرا یہ گھمنڈ چور چور کر دیا۔ میں اتنے دنوں کے یوگ سادھن کے بعد بھی ایک کمزور انسان ہوں یہ تعلق محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہوتا ہے اور یوگ تپ بیراگ کوئی بھی تعلق کو توڑ نہیں سکتا۔

سنجیون لال ''مہاراج! آپ نے جو کچھ کر دکھایا وہ بھی معجزے سے کم نہیں سہاما جیسی دیوی پرتاپ چند جیسا بیٹا ہر شخص نہیں تیاگ سکتا''

سوامی جی: ''متر یہ سب ایشور کی رچنا تھی۔ مجھے شروع ہی سے اپنے بھائیوں کی بھلائی کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور جو کچھ میرے کیے ہو سکتا تھا اس سے ان کی خدمت کرتا رہتا تھا۔ مگر یہ دلی آرزو تھی کہ ایشور میرے گھر میں کوئی قوم کا فدائی پیدا کرتا۔ میں ایشور سے ہمیشہ یہی پرارتھنا کیا کرتا آخر لکشمی جی نے سہاما کو درشن دیئے اور سہاما نے مہارانی سے منہ مانگا وردان پایا۔ اسی رات مجھے بھی بیراگ کا سندیسہ ملا''

سنجیون لال: ''ایشور کی لیلا اپار ہے اگر مہاراج بیراگ نہ پاتے تو بالا جی آج کس

کی شرن لیتے''

سوامی جی: ''بالا جی ابھی تہہ پر نہیں پہنچے ہیں اور نہ میں انہیں جتانا مناسب سمجھتا ہوں ورنہ وہ یہاں سے جانا ہرگز منظور نہ کریں گے۔ دیکھیے اس تھوڑی سی مدت میں انہوں نے کیسا حیرت انگیز کام کیا ہے۔ اس سن میں ایسا ضبط اور یوگ میں نے نہیں دیکھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایسے بیٹے کا باپ ہوں''

سنجیون لال: ''پچھلے دنوں کونٹ پنڈ لشام سے انہوں نے راج نیت پر جو مباحثہ کیا اسے سن کر میں حیرت میں آ گیا''

سوامی جی: ''یہ کونٹ علماء میں سر آمد روزگار سمجھے جاتے ہیں''

سنجیون لال: ''مجھے لنکا میں ایک بار ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا''

سوامی جی: خیر علم تو ایک ایسی چیز ہے جو شوق و شغفت سے روز بروز ترقی پا سکتا ہے مگر اس وقت بالا جی کو ہمیشہ کے لیے رخصت کرنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کے دل میں کمزوری تو باقی نہیں ہے۔

مجھے یہ تجربہ ہے کہ بعض آدمی مدت تک بیراگ میں رہنے کے بعد یکا یک ناگفتہ بہ کمزوریاں کر بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً اس براگی کے لیے جو اس دنیا میں رہ کر اس سے الگ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو، انتہا درجہ کے مضبوط دل کی ضرورت ہے۔ ہم اور آپ اس کنج خلوت میں بیٹھے ہوئے دنیا کی گمراہیوں اور لغزشوں سے بچے رہ سکتے ہیں مگر پانی پر کنول بن جاتا اس بدرجہا مشکل بات ہے

سنجیون لال: ''مجھے یقین کامل ہے کہ کوئی دنیاوی طاقت بالا جی کو فرض اور حق کے راستہ سے نہیں پھیر سکتی''

سوامی جی: ''خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے مگر یقین جب ہی ہو سکتا ہے جب ایک بار انہیں آزما لوں۔ میں یہ آزما کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کا ضبط اور ترک ارادی ہے یا طبیعت ثانی، قوم کی خدمت پہلے تو ایک تپسیا معلوم ہوتی ہے۔ مگر دنوں کے ساتھ نا

خدائے قوم کا ظاہری اعزاز و اقتدار بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے روبرو بادشاہوں کی گردنیں بھی جھک جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ جو آنکھیں شمشیر برہنہ کے ساتھ کبھی نہیں جھپکیں وہ مئے گلفام کے ایک پیالہ سے سرشار ہوگئی ہیں اور جو دل سختیوں اور آفتوں کے طوفان سے بھی نہیں ڈرے، وہ مدارات و عنایات کی خوشگوار تھپکیوں میں نہ سنبھل سکے''

سنجیون لال: ''اس کا امتحان کیونکر ہوگا؟''

سوامی جی: ''ہم اور آپ مل کر بالاجی کے نفس پر زور ڈالیں گے۔ آپ کو اس لیے شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میں تنہا غالباً ان کی آتما پر کچھ اثر نہیں پہنچا سکوں گا۔ ان کی یوگ شکتی ان دنوں بہت بڑھی ہوئی ہے''

پرتاپ چندف گیان سروور کے کنارے اپنے خیال میں مگن بیٹھا ہوا تھا کہ اسے کچھ غنودگی سی معلوم ہوئی اور جمائیاں آنے لگیں۔ مگر اس نے چونک کر آنکھیں نہ ملیں اور اپنے خیالوں میں مگن ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اس پر غنودگی کا غلبہ ہوا اور آنکھیں جھپکنے لگیں جیسے کوئی رات بھر کا جاگا ہوا آدمی صبح کے وقت نیند سے متوالا ہو جائے۔ پرتاپ کو تعجب ہوا کہ آج مجھے اتنی نیند آرہی ہے۔ اس نے پانی کے چھینٹے منہ پر دیئے اور دل میں مضبوط ارادہ کرلیا کہ اب نیند کو ہرگز نہ آنے دوں گا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا کہ پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آنکھیں خواب گراں سے مخمور ہو کر مندنے لگیں اور انگڑائیوں کے مارے اعضاء ٹوٹنے لگے۔ پرتاپ کی سمجھ میں نہ آیا کہ میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک تیزی سے چلتا رہا۔ بعدازاں اپنی جگہ پر آبیٹھا۔

اس طرح نیند نے اس پر چھ نا کام حملے کیے۔ ایک اور ایک پر زور مگر ساتواں حملہ پرتاپ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آنکھیں بند ہوگئیں اور گردن جھک گئی اس کی آتما اب کی بار مغلوب ہوگئی۔

مدہوشی کا غلبہ ہوتے ہی پرتاپ چند کو ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی پر فضا باغ میں آ گیا ہوں عنبر ریز ہوائیں چل رہی ہیں اور ہر ایک درخت پر خوش رنگ اور شیریں نوا چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں ہوا میں کچھ ایسی فرحت ہے طیور کی شیریں نوائیوں میں وہ مستانہ پن اور مہک میں وہ نشہ ہے کہ دل و دماغ متوالے ہوئے جا رہے ہیں۔

بہار اپنی دل فریبیوں کے پورے سامان لے کر آ پہنچی ہے۔ پرتاپ متحیر تھا کہ میں اس جنت کدے میں کیونکر آ پہنچا ہوں۔ ابھی تو میں گیان سرووَر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں یہ سوچ کر اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پختہ یقین کر لیا کہ یہ خواب نہیں ہے میں ضرور بھٹک کر کسی کے باغیچہ میں چلا آیا۔

وہ ادھر ادھر روشوں میں ٹہلنے لگا کہ دفعتاً ایک نازنین سایہ دار درختوں کی آڑ سے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس پر حسن کا روپ تھا اور نزاکت کا سنگھار وہ روشنی کی ایک تصویر معلوم ہوتی تھی۔ پرتاپ چند کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹکی اور چشم پرنم سے دیکھ کر بولی ''پرتاپ''

پرتاپ چند نے اسے پہچان لیا

وہ برج رانی تھی مگر اس آب و گل کی برج رانی سے بدرجہا بہتر اور حسین ہے۔ متحیر ہو کر بولا ''برجن! تم یہاں کہاں؟''

برج رانی: ''جہاں تم ہو وہاں میں بھی ہوں محبت نے تمہارا پتہ دیا، اگر تم مہک بن کر پھولوں میں سما جاتے تو بھی میں تمہیں ڈھونڈ نکالتی، تمہیں شاید معلوم نہیں میں نے دوسرا جنم لیا ہے''

پرتاپ: ''(حیرت سے) دوسرا جنم!''

برج رانی: ''ہاں اب کی بار میرا جنم دیولوک میں ہوا ہے مگر جب سے ہوش سنبھالا ہے تمہارے بیوگ میں گھل رہی ہوں۔ یہ میرے باپ کا باغ ہے تمہارا استھان یہاں سے بہت قریب ہے۔ تمہیں معلوم نہیں مگر میں دن میں کئی بار تمہارے درشن